© rasailojaraid.com

اِستِدراک

از ایڈیٹر

فاضل مقالہ نگار نے اسلامی تعزیرات کے خلاف مغربی نقطۂ نظر پر جو تنقید کی ہے، اس پر ہم مزید دو نکات کا اضافہ کریں گے۔

پہلا نکتہ یہ ہے کہ دورِ جدید میں اہلِ مغرب کی رائے عام کو (جو اُن کے ہاں قانون کا اصل سرچشمہ ہے) اور ان کے قانون سازوں اور ان کی عدالتوں کو اِس تخیل نے بہت متأثر کیا ہے کہ جُرم دراصل ایک ارادی عمل نہیں ہے بلکہ مجرم کی ذہنی بیماری کا نتیجہ ہے جس پر سزا دینے کے بجائے ہمدردی کے ساتھ اس کا علاج ہونا چاہیے۔ یہ تأثر اگرچہ ابھی تک اس حد کو نہیں پہنچا ہے کہ وہاں جیلوں کی جگہ ذہنی امراض کے شفاخانے لے لیں، لیکن اس کا نتیجہ یہ ضرور ہُوا ہے کہ اخلاقی جرائم کے معاملہ میں قانون کا رویّہ روز بروز نرم ہوتا چلا جا رہا ہے اور مغربی ممالک میں جرائم کی بڑھتی ہوئی رفتار بڑی حد تک اِسی نرم رویّہ کی رہینِ مِنّت ہے۔ قطع نظر اس سے کہ اس نظریے کے دلائل میں کیا وزن ہے اور کیا نہیں ہے، ایک شخص جب عملاً یہ دیکھتا ہے کہ جہاں جرائم کے متعلق یہ نقطۂ نظر اختیار کیا گیا ہے وہاں تو وہ خوفناک رفتار سے بڑھ رہے ہیں، اور جہاں اسلامی تعزیرات نافذ ہیں وہاں وہ بالکل مفقود ہونے کے قریب پہنچ گئے ہیں، تو وہ یہ سوال کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ آخر یہ کیسی "ذہنی بیماری" ہے جو مغرب میں بڑھ رہی ہے اور سعودی عرب میں گھٹ رہی ہے؟ اگر جرم واقعی کسی بیماری کا نتیجہ ہے، اور سزا اس کا کوئی علاج نہیں ہے تو سعودی عرب میں بھی اس مرض کے مریض اُسی رفتار سے پیدا ہونے چاہییں جس رفتار سے مغربی ممالک میں پیدا ہو رہے ہیں لیکن جب ہم علانیہ یہ دیکھتے ہیں کہ وہاں ان کی پیدائش قریب قریب بند ہو گئی ہے تو اس کے معنی لازماً یہ ہیں کہ اس مرض کے علاج کا بہترین طریقہ وہ نہیں ہے جو اہلِ مغرب تجویز کر رہے ہیں، بلکہ یہ ہے کہ قاتلوں سے برسرِ عام قصاص لیا جائے، چوروں کے ہاتھ مجمعِ عام میں کاٹے جائیں، اور زانیوں پر پبلک کی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نگاہوں کے سامنے کوڑے برسائے جائیں۔ اس طریقہ سے اُن بہت سے افراد کا نفسیاتی آپریشن ہو جاتا ہے جن کے اندر جُرم کی بیماری موجود ہوتی ہے، اور وہ غدود خشک ہو جاتے ہیں جن سے مجرمانہ رجحانات ابھارنے والی رطوبتوں کی تراوش ہُوا کرتی ہے۔

دوسرا نکتہ یہ ہے کہ موجودہ دَور میں مغربی ممالک کے عوام و خواص اور ان کے قانون سازاداروں اور عدالتوں کی ہمدردیاں اب اُس معاشرے کے لیے نہیں ہیں جسے مجرموں کے جرائم سے بے شمار نقصانات پہنچتے ہیں، اور اُن مظلوموں کے لیے بھی نہیں ہیں جو ان کی زیادتیوں کے شکار ہوتے ہیں، بلکہ اُن مجرموں کے لیے ہیں جنہیں سزا دی جاتی ہے۔ اسی طرح اُن کا احساسِ عدل و انصاف بھی زیادہ تر مجرموں کے حقوق کی حفاظت ہی کے لیے بے چین ہوتا ہے بہ نسبت اس کے کہ اسے معاشرے کے حقوق اور جرائم کا شکار ہونے والے افراد کے حقوق کی کوئی فکر ہو۔

ہم یہاں اُس صورتِ حال کو مثال کے طور پر لیتے ہیں جو اس رویّے نے امریکہ میں پیدا کی ہے۔ ابھی چند مہینے پہلے جنوری ۱۹۶۷ء کے ریڈرز ڈائجسٹ میں ایک مضمون شائع ہوا ہے جس کا عنوان ہے "ہمارے ہاں غیر مجرموں کے لیے بھی کچھ انصاف ہونا چاہیے"۔ ذیل میں ہم اس کا ایک مختصر سا خلاصہ درج کرتے ہیں جس سے اندازہ ہو گا کہ جرائم اور مجرموں کے متعلق اب مغربی عدل و انصاف کے رجحانات کس طرف جا رہے ہیں اور ان کے نتائج کیا ہیں:

پچھلے ۹ سال میں امریکی سپریم کورٹ سے مسلسل ایسے فیصلے صادر ہوتے ہیں جن کی تعبیرِ قانون رفتہ رفتہ پولیس کے ہاتھ باندھتی چلی گئی ہے اور مقدمات کی سماعت کرنے والے جج اور جمہوری انصاف کے معاملہ میں مفلوج ہوتے چلے گئے ہیں، اور یہ سب کچھ مجرموں کے فائدے کے لیے ہے۔ اب پولیس پر یہ لازم کر دیا گیا ہے کہ جب کبھی وہ کسی جُرم کے شبہ میں کسی شخص کو گرفتار کرے تو پوچھ گچھ کرنے سے پہلے اس کو خبردار کر دے کہ وہ خاموش رہنے اور کسی سوال کا جواب نہ دینے کا پُورا حق رکھتا ہے۔ بلکہ اگر وہ کسی طرح یہ ظاہر کر دے کہ وہ پولیس کے سوالات کا جواب نہیں دینا چاہتا تو پولیس کو پوچھ گچھ بند کر دینی چاہیے۔ علاوہ بریں پولیس کا یہ فرض بھی ہے کہ مشتبہ شخص کو دورانِ تفتیش

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

میں ایک وکیل فراہم کر کے دے اور اگر اس کی یہ خواہش ہو کہ پوچھ گچھ کے وقت اس کا وکیل موجود رہے تو لازماً اس کی اجازت دینی ہو گی۔ ان فیصلوں میں ملزموں کے اعترافِ جرم کو قریب قریب بے معنی بنا کر رکھ دیا گیا ہے۔ حتیٰ کہ جہاں اس کے صحیح ہونے کے تمام قرائن اور شواہد موجود ہوں، وہاں بھی کسی خفیف سے خفیف قانونی سُقم کی بنا پر اسے اٹھا کر پھینک دیا جاتا ہے۔ خواہ اس امر میں کوئی شبہ باقی نہ رہا ہو کہ ملزم نے واقعی جُرم کا ارتکاب کیا ہے۔ اس کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

واشنگٹن ڈی سی کی عدالت میں ۱۸ سال کا ایک شخص پیش ہُوا جس نے اپنی بیوی کو قتل کر کے کوڑے کے ڈھیر میں پھینک دیا تھا۔ تین مختلف اوقات میں وہ خود اقرار کر چکا تھا کہ قتل کا ارتکاب اسی نے کیا ہے۔ پولیس کو وہ خود جائے واردات پر لے گیا تھا۔ اس کے باوجود اسے چھوڑ دیا گیا کیونکہ سپریم کورٹ کے فیصلوں کی وجہ سے اعترافِ جرم کی کوئی قدر و قیمت باقی نہیں رہی ہے۔

ایک خاندان نے اپنے گھر میں رنگ روغن کرانے کے لیے ایک رنگ ساز لگا رکھا تھا۔ ایک روز وہ شراب پیے ہوئے اپنے کام پر گیا۔ گھر والوں نے اس حالت میں اس سے کام لینے سے انکار کر دیا۔ اس پر ناراض ہو کر اس شخص نے رات کے وقت اس گھر پر آگ لگانے والا بم (مولوٹاف کاک ٹیل) پھینک دیا جس سے سارا گھر جل گیا، گھر والی جو اپنے تین بچوں کے ساتھ سوئی پڑی تھی مشکل مرتے مرتے بچی، اور ۱۰۰ ہزار ڈالر کا مالی نقصان ہوا۔ پولیس کا ایک آدمی فوراً موقع پر پہنچ گیا جبکہ مجرم ابھی وہاں موجود تھا۔ ایک شخص نے اسے بتایا کہ یہ آدمی ہے جس نے آگ لگائی تھی۔ پولیس والے کے پوچھنے پر اس نے خود اقرار کیا کہ ہاں میں نے آگ لگائی تھی لیکن جب مقدمہ چلا تو عدالت نے اس کے اعترافِ جرم کو صرف اس بنیاد پر خارج از بحث قرار دے دیا کہ پولیس کے ایک باوردی سپاہی کی موجودگی بجائے خود ملزم کو ذہنی حیثیت سے اس قدر خوف زدہ کر دینے کے لیے کافی تھی کہ اس نے مجبوراً اپنے آپ کو خود مجرم ٹھیرا دیا، اور اس طرح اُس کا وہ حق مارا گیا جو امریکی دستور نے اسے دیا ہے کہ کسی شخص کو اپنے خلاف شہادت دینے پر مجبور نہ کیا جائے گا۔

کلیولینڈ میں ایک نوجوان نے ایک دوسرے نوجوان کو قتل کرنے کا اقرار کیا، مگر عدالت

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نے اس بنا پر اسے چھوڑ دیا کہ تفتیش سے پہلے پولیس نے اسے اُس کے حقوق سے آگاہ نہیں کیا تھا۔ جج نے اپنے فیصلہ میں لکھا کہ مجھے اس امر میں کوئی شک نہیں ہے کہ قاتل یہی شخص ہے اور اس نے جان بوجھ کر بالارادہ کسی معقول وجہ کے بغیر مقتول کی جان لی ہے، لیکن سپریم کورٹ کے اُن فیصلوں نے میرے ہاتھ باندھ دیئے ہیں جو معاشرے کے حقوق پر افراد کے حقوق کو ترجیح دیتے ہیں۔

واشنگٹن ڈی سی میں ایک شخص نے ایک عورت کے ساتھ زنا بالجبر کا ارتکاب کیا۔ وہ خود اپنے اس جرم کا اعتراف کر چکا تھا، مگر عدالت نے اس وجہ سے اس کو بری کر دیا کہ ملزم کو تھانے لے جا کر پوچھ گچھ کرنے میں پولیس نے اتنا وقت صرف کر دیا تھا کہ مجسٹریٹ کے سامنے اسے پیش کرنے میں ناروا تاخیر ہو گئی۔ یہ ۱۹۵۷ء کا مقدمہ تھا جس میں ۱½ گھنٹے کی تاخیر کو ناروا ٹھیرایا گیا تھا۔ ۱۹۶۲ء کے ایک مقدمہ میں تین گھنٹے کی، ۱۹۶۴ء کے ایک اور مقدمہ میں آدھ گھنٹے کی اور ۱۹۶۵ء کے ایک مقدمہ میں پانچ منٹ کی تاخیر غیر معقول قرار دی گئی۔ گویا بحث اس سے نہیں کہ مجرمین کے جرائم کتنے گھناؤنے ہیں، اور وہ بجائے خود ثابت ہیں یا نہیں، بلکہ اصل مدارِ بحث یہ ہے کہ اُن کے قانونی حقوق کا، جو روز بروز لطیف سے لطیف تر ہوتے جا رہے ہیں، پورا پورا تحفظ کیا گیا ہے یا نہیں۔ اگر ان حقوق کا لحاظ کرنے میں کوئی خفیف سے خفیف اصطلاحی خامی بھی رہ گئی ہو تو وہ مجرم کو چھوڑ دینے کے لیے کافی ہے اور اس بات کی کوئی پروا نہیں کہ عدالت سے بری ہونے کے بعد پہلی فرصت ہی میں وہ پھر کسی کی جان، مال یا آبرو پر دست درازی کر بیٹھے۔

مجرمین کے ساتھ ان رعایتوں کا حاصل یہ ہوا ہے کہ فلیڈلفیا میں اب پولیس جن لوگوں کو جرائم کے شبہ میں گرفتار کرتی ہے ان میں سے ۵۶ فی صدی ہر سوال کا جواب دینے سے انکار کر دیتے ہیں۔ بروکلین میں پہلے جتنے لوگ پولیس کی پوچھ گچھ کا جواب دینے سے انکار کرتے تھے اب ان سے چار گنے یہ طریقہ اختیار کر رہے ہیں۔ قریب قریب یہی حال امریکہ کے بیشتر شہروں کا ہے جس کی وجہ سے بکثرت جرائم کی وارداتوں کا سراغ لگانا ناممکن ہو گیا ہے ——— یہ ہے جرم اور مجرمین کے معاملہ میں مغربی قانون اور انصاف کا رویہ۔ سوال یہ ہے کہ اسلامی قانونِ تعزیرات پر ان لوگوں کے اعتراض کو آخر ہم کیا وزن دیں اور کیوں دیں؟

© rasailojaraid.com